مولانا فراہیؒ کا طریقۂ تفسیر

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، یہ علوم و معارف کی ایک پوری کائنات اپنے اوراق میں، اپنے صفحات میں بلکہ اپنی ایک ایک سطر اور اپنے ایک ایک لفظ میں لیے ہوئے ہے۔ اس چشمۂ صافی سے جس بندۂ خدا کو توفیق ملی بقدر ظرف سیراب ہوا اور دنیا کو بقدر توفیق سیراب کرتا رہا، لیکن اس کی بے پایاں حکمتوں اور باریکیوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے؟ حدیث شریف میں آتا ہے، لا یشبع منہ العلماء ولا یخلق عن کثرۃ الرد ولا ینقضی عجائبہ۔[1]

اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ضعیف قرار دیا ہے[2] لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بہت قوی اور حقیقت پر مبنی ہے اس لیے کہ اس کے ساتھ تاریخ ہے۔ قرآن مجید کے نزول پر چودہ سو سال گزر گئے لیکن قرآن مجید کے عجائب نہ ختم ہوئے اور نہ ہوں گے۔ آج بھی کوئی طالب علم اگر خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اس پر غور کرے تو یقین ہے کہ وہ اس احساس سے کبھی دوچار نہ ہوگا کہ اس بحر بے کراں کو پوری طرح چھان لیا گیا ہے اور اب اس کی شناوری لاحاصل ہے بلکہ نئے نئے حقائق اس پر منکشف ہوں گے اور اس کے الفاظ میں پوشیدہ معانی کی وسیع دنیا سے روشناس ہوگا۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ بیسوی صدی کی تیسری دہائی ختم ہونے میں چند ماہ باقی رہ گئے تھے (سنہ ۱۹۳۰ء) کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس سے پہلے قرآن مجید پر اتنی

---

[1] ترمذی۔ فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن

[2] علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی حارث کو امام شعبی جھوٹا قرار دیتے ہیں لیکن ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ دیکھئے الجامع لاحکام القرآن جلد اول ص ۵

گوناگوں اور متنوع خدمات انجام پاچکی تھیں کہ اس میدان میں بظاہر کسی نئی تحقیق یا بڑی کامیابی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی لیکن مولانا فراہیؒ کے کارناموں کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے "کم ترک الاول للآخر"۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ نے قرآن مجید پر غور و فکر ہی کو اپنا مقصد حیات بنالیا تھا۔ وہ اسی پر سوچتے اور اس کے متعلقات پر غور فرماتے تھے، ان کی ساری علمی تحقیقات اسی کی روشنی میں ہوتی تھیں، کسی اور موضوع سے انھیں دلچسپی نہیں رہی اور کسی اور طرف انھوں نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے وہ تیئس سال کے دوران وقتاً فوقتاً، تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے اسے اسی ترتیب کے ساتھ جمع کرایا جس ترتیب سے وہ لوح محفوظ میں موجود تھا اور موجود ہے۔ اسی ترتیب کے مطابق وہ پڑھا اور پڑھایا گیا، آج بھی پڑھا پڑھایا جارہا ہے۔ اس ترتیب سے امام رازیؒ، ابوبکر نیشاپوری اور ابن عربی جیسے علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور بظاہر صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن کی آیات میں گہرا معنوی ربط ہے اور اسے انھوں نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ علامہ حمید الدین فراہیؒ اسی کے قائل ہیں، اسے انھوں نے جس طرح ایک فکر اور فلسفہ کی شکل عطا کی ہے اس سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ مولانا کے نزدیک پورا قرآن ایک مربوط کتاب ہے اور اس کی چھوٹی بڑی سورتیں اس کے ابواب و فصول ہیں، ہر سورہ کا ماسبق اور بعد کی سورتوں سے گہرا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کی توضیح اور تکمیل کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جس سے اس کے تمام مباحث براہ راست یا بالواسطہ متعلق ہوتے ہیں۔

مولانا کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ سورہ کے داخلی اشارات، اس کے بیانات اور اس کے مجموعی مطالعہ سے وہ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ اس میں اصلاً کس گروہ یا کن گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے، کن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، کس ذہن و فکر کی اصلاح کی گئی ہے اور کن پہلوؤں سے اہل ایمان کی ہدایت کا سامان کیا گیا ہے؟ ـــ ان سب امور کی روشنی میں مولانا جس طرح آیات کی تشریح کرتے ہیں متقدمین میں اس کی جھلک تو ضرور ملتی ہے لیکن پورے قرآن کو اس انداز میں سمجھنے سمجھانے کی اس کوشش کو فہم قرآن کی ایک نئی راہ کہنا غلط نہ ہوگا، اس کا دروازہ نہ کبھی بند تھا اور نہ کبھی بند ہوگا۔

تفسیر کا ایک عام اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے اس لیے کہ "القرآن

یفسر بعضه بعضا" دوسرے ذرائع اس کے بعد آتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ جو سلف کے بہت بڑے نمائندہ ہیں اور جن کی کتاب و سنت پر بڑی گہری نظر ہے فرماتے ہیں:

فان قال قائل فما احسن طرق التفسير فالجواب ان اصح الطرق فی ذلك أن يفسر القرآن بالقرآن فما اجمل فی مكان فانه قد فسر فی موضع آخر وما اختصر من مكان فقد بسط فی موضع آخر فان اعياك ذلك فعليك بالسنة فانها شارحة للقرآن وموضحة له[1]

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے اس لیے کہ ایک جگہ اس میں اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کردی گئی ہے اور جو چیز ایک جگہ اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے اسے دوسری جگہ پھیلا دیا گیا ہے، اگر اس سے تمھاری دشواری حل نہ ہو تو سنت کو مضبوطی سے پکڑو اس لیے کہ وہ قرآن کی شارح اور اس کے اجمالات کو کھولنے والی ہے۔

یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر اور علامہ سیوطیؒ نے "الاتقان" میں کہی ہے۔

مولانا فراہیؒ نے تفسیر القرآن بالقرآن پر بڑا زور دیا ہے ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ قرآن ہی سے اس کے مشکل مقامات حل ہوں۔ اس کے ذریعہ انھوں نے بہت سے عقدے کھولے ہیں وہ جس لفظ پر بحث کرنا چاہتے ہیں پہلے ان تمام آیات کا استقصا کرتے ہیں جن میں یہ لفظ آیا ہے اور پھر اس کے استعمالات پر غور کرتے ہیں، اس کے بعد اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی طریقہ قرآنی اصطلاحات اور آیات کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ سورہ احزاب کی آیت ۳۳ میں 'اہل بیت' کا لفظ آیا ہے، مفسرین نے

۱؎ فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۱۳ ص ۳۶۳

لکھا ہے کہ اس سے مراد ازواج مطہرات ہیں۔ مولانا فراہی نے اس سلسلہ میں کئی اہم باتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید نے اہل بیت کا لفظ صرف عورتوں (بیویوں) ہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے (یعنی ایک ہو یا زیادہ) استعمال ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر ہمیشہ جمع اور مذکر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں عورت کے احترام کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اس پوری بحث کو انھوں نے قرآن مجید کے استعمالات سے مدلل کیا ہے۔ یہ تفصیل و تجزیہ دوسرے مفسرین کے یہاں نہیں ملتا۔

مولانا سورہ کے مرکزی موضوع، آیات کے سیاق و سباق اور نظائر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین فرماتے ہیں۔ اس سے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمارے تفسیری ذخیرہ کو دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے یا اسے نظر انداز کررہے ہیں۔ یہ خیال اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا کے یہاں قدیم مفسرین اور ان کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر تفسیر کی تمام اہم اور متداول کتابیں رہی ہیں ان کا انھوں نے بڑی باریک بینی اور دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ لیکن وہ کسی رائے کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کرتے کہ وہ کسی بڑے مفسر کی رائے ہے بلکہ وہ اس بنیاد پر چلتے ہیں "هم رجال ونحن رجال" وہ ان سب کی رایوں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کتب تفسیر میں عام طور پر ایک ایک آیت کے ذیل میں بہت سے اقوال اور بہت سی توجیہات ملتی ہیں۔ مفسرین اپنی تحقیق کی روشنی میں ان میں سے کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں، کسی قول کو ضعیف قرار دے کر رد کردیتے ہیں۔ کسی رائے کو جمہور کی رائے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، کسی کو شاذ رائے کہتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ ان تمام دعووں کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ انھیں ایک جوہری کی طرح پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس قول کو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے قریب پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ زیادہ تر مواقع پر مولانا کی تائید میں متقدمین کے اقوال میں کوئی نہ کوئی قول یا کسی نہ کسی مفسر کی رائے صراحتاً مل جاتی ہے اور بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی آیت کے ذیل میں کوئی قول مولانا کے لیے غور و فکر کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اسے وہ دوسری ہم معنی آیات پر بھی منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب اس میں کامیابی ہوجاتی ہے تو اس سے وہ ایک اصول کلیہ وضع کرتے ہیں اور اس کی

روشنی میں اس طرح کی تمام آیات کی توجیہ کرتے ہیں۔ وہ اس قول کا غالباً اس لیے ذکر نہیں کرتے کہ وہ کوئی اصول نہیں بیان کرتا۔ اس سے صرف ایک آیت کی توجیہ ہوتی ہے۔ اب ہم بعض مثالوں سے اسے واضح کرنے کی کوشش کریں گے:

سورۂ فاتحہ کو قرآن مجید کا دیباچہ کہا جاسکتا ہے اس کے بعد سورۂ بقرہ قرآن کی سب سے بڑی سورہ ہے، جس میں مباحث اور موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ قرآن کے بیشتر احکام اس میں آگئے ہیں۔ مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ اس سورہ میں یہود سے خطاب ہے ان کے فساد اور بگاڑ کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی کمزوریوں کی نشان دہی کی گئی ہے اس کے بعد امت مسلمہ کو منصب امامت پر سرفراز کیے جانے کا اعلان ہے۔ اسی ذیل میں بہت سے احکام دیے گئے ہیں، سورہ کی ابتداء الٓمّٓ کے بعد ذٰلک الکتاب سے ہوئی ہے۔ بظاہر یہ ھذا الکتاب کا موقع تھا، سوال یہ ہے کہ ذٰلک کیوں کہا گیا؟ چنانچہ زیادہ تر مفسرین نے ذٰلک کو ھذا کے معنی ہی میں لیا ہے۔ کسی نے یہ کہا کہ یہ الٓمّٓ کی طرف اشارہ ہے، الٓمّٓ پہلے گزر چکا ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے پہلے قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہو چکا تھا ذٰلک سے اس کی طرف اشارہ ہے۔[1] ان توجیہات سے پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا، مولانا فراہیؒ نے پوری سورہ کی روشنی میں اس سے جو بحث کی ہے اس سے ذہن کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک چونکہ سورہ میں خطاب یہود سے ہے اس لیے ذٰلک الکتاب " سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے ذہنوں میں ہے جس کا ذکر ان کے صحیفوں میں ہے، جس کے بارے میں وہ شک اور تردد میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ اس سے آگے کی آیات کی بھی بہترین توجیہ ہو جاتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اسے وہی لوگ تسلیم کریں گے اور اس سے ہدایت پائیں گے جن کے اندر تقویٰ ہے، جو غیب کی حقیقتوں پر یقین اور اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ کی یہ بات بالکل نئی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد ہمیں ابن جریر میں ملتی ہے وہ کہتے ہیں " وقد قال بعضھم یعنی بہ التوراۃ والانجیل " اس کے ساتھ مزید فرماتے ہیں کہ اس تاویل کو مان لیا جائے تو پھر ذٰلک کی کسی توجیہ کی ضرورت نہیں پیش آتی۔

---

[1] تفسیر طبری جلد اول ص ۲۲۶-۲۲۷

اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ذٰلک کے ذریعہ ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔[1]

قرطبی کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں، قیل ان اللہ تعالیٰ قد کان وعد اھل الکتاب ان تنزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کتابا فالاشارۃ الی ذٰلک الوعد، قال المبرد ھذا القرآن ذٰلک الکتاب الذی تستفتحون بہ علی الذین کفروا۔[2] یہاں 'قیل' کے ذریعہ اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن مولانا فراہیؒ نے اسے کم زور سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے اہمیت دی اور اس سے انھیں اس آیت کی توجیہ میں بلکہ پوری سورہ کے بارے میں ایک نقطۂ نظر قائم کرنے میں غالباً مدد ملی ہے۔

سورہ بقرہ ہی کی آیت ۶۲ ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ ایمان لانے والوں کے لیے بھی کامیابی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں اور عمل صالح اختیار کریں، یہ سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا تھا اور بہت ممکن ہے اور حضرات کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ آخر ایمان والوں سے ایمان اور عمل صالح کا مطالبہ کیوں کیا گیا ہے۔ ان خوبیوں کے بعد ہی میں تو وہ اہل ایمان قرار پائے۔ ان میں وہ کم زوریاں کہاں سے آگئیں جو دوسرے گمراہ فرقوں میں تھیں ؟۔ ابن جریر فرماتے ہیں، معنی ایمان المؤمن فی ھذا الموضع ثباتہ علی ایمانہ وترکہ تبدیلہ واما الیہود والنصاریٰ والصابئین فالتصدیق بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وبما جاء بہ[3] یعنی اہلِ ایمان سے

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول ص ۲۲۷-۲۲۸

[2] تفسیر قرطبی جلد اول ص ۱۵۸

[3] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۱۴۸

مطالبہ کا مطلب کچھ اور ہے اور یہود و نصاریٰ اور صابٔہ سے اس کا مطالبہ کچھ اور ہے۔ زیادہ تر مفسرین نے یہی بات کہی ہے۔ لیکن مولانا فراہیؒ قرآن کے استعمالات کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ قرآن 'الذین آمنو' اور 'المومنون' میں فرق کرتا ہے وہ جب 'الذین آمنوا' کہتا ہے تو اس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والا گروہ مراد ہوتا ہے۔ اس میں کم زور ایمان، اور قوی ایمان والے دونوں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ مفسرین کے ہاں یہ بات نہیں ملتی۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری کہتے ہیں، قال سفیان: المراد المنافقون کانہ قال: الذین آمنوا ظاھرا مرھم فلذلك قرنھم بالیھود والنصاریٰ والصابئین، ثم بین من آمن باللہ والیوم الآخر من جمیعھم۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آمنوا سے ہمیشہ مخلص اہل ایمان ہی مراد نہیں ہوتے۔ یہ بات حضرت سفیان ثوری نے آیت زیر بحث کے سلسلہ میں کہی ہے لیکن مولانا فراہیؒ نے اسے قرآنی استعمالات کی روشنی میں کلیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مولانا کے تفاسیر سے استفادہ اور ان کی قرآنی بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۸ ہے:

یَاۤ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَاۤفَّۃً۔	اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس میں طبری، سیوطی اور بعض دوسرے مفسرین نے "کافۃ" کو "سلم" کا حال مانا ہے۔ اس کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور اس کی تمام احکام کی پابندی کرو۔ اس لیے کہ بعض احکام کی پابندی اور بعض کی خلاف ورزی اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ چنانچہ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں:

کافۃ حال من السلم ای فی جمیع شرائعہ۔[1]	'کافۃ' کا لفظ 'سلم' سے حال ہے، مطلب یہ کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، اس کے تمام احکام شریعت کو قبول کرو۔

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۴۳۲

کافۃ کے معنی جماعت کے ہیں اس کا مادہ کف ہے، جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ جماعت کو کافۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ افراد کو گھیرے رہتی ہے۔ الگ ہونے نہیں دیتی۔

مولانا فراہیؒ کے نزدیک کافۃ ادخلوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ زمخشری نے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

کافۃ لا یخرج احد منکم یدہ عن طاعتہ۔	سب کے سب۔ تم میں سے کوئی بھی اس کے دائرۂ اطاعت سے باہر قدم نہ رکھے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ دوسرا مفہوم بھی صحیح ہے۔

ویجوز ان یکون کافۃ حال من السلم... علی ان المؤمنین امروا بأن یدخلوا فی الطاعات کلھا وان لا یدخلوا فی طاعۃ دون طاعۃ او فی شعب الاسلام وشرائعہ کلھا وان لا یخلوا بشئ منھا۔[2]	اس کی بھی گنجائش ہے کہ 'کافۃ' کا لفظ 'سلم' سے حال ہو۔ مطلب یہ کہ مومنوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ (اسلام میں پوری طرح آجائیں) اس کے تمام احکام کی اطاعت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک حکم کو مانیں دوسرے کو نہ مانیں؛ یا یوں کہنا چاہیے کہ اسلام اور اس کے تمام قوانین پوری طرح اختیار کریں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں۔

گویا مولانا فراہیؒ نے عام مفسرین کے اختیار کردہ مفہوم کے مقابلہ میں اس مفہوم کو اختیار کیا ہے جسے زمخشری نے ترجیح دی ہے۔

[1] جلالین

[2] الکشاف عن حقائق التنزیل: ۱/۳۵۳

سورۂ بقرہ کی آیت "لا اکراہ فی الدین"[1] کا بالعموم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دین کے قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ہر ایک کو آزادی حاصل رہے گی۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس آیت میں جبر فطری کی نفی ہے یعنی اللہ نے کسی انسان کو دین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ اسے آزاد پیدا کیا ہے کہ وہ چاہے تو دین کو اختیار کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مولانا کی یہ تفسیر بظاہر نئی ہے لیکن بعض قدیم مفسرین نے اسے اختیار کیا ہے۔ چنانچہ زمخشری کہتے ہیں لا اکراہ فی الدین أی لم یجر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکین والاختیار ونحوہ قولہ تعالیٰ ولو شاء ربك لآمن من فی الارض کلھم جمیعًا أفانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین ای لو شاء لقسرھم علی الایمان ولکنہ لم یفعل وبنیٰ الامر علی الاختیار۔ یہی نہیں بلکہ اس آیت کی عام طور سے جو تفسیر کی جاتی ہے اسے زمخشری نے کم زور قول کی حیثیت سے پیش کیا ہے وقیل ھو اخبار فی معنی النھی ای لا تکرھوا فی الدین ثم قال بعضھم وھو منسوخ بقولہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم[2]

یہ سورۂ بقرہ کی بعض آیات تھیں۔ اب ہم سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیات کا حوالہ دیں گے۔ اس ذیل کی پہلی آیت ہے:

واذا اردنا ان نھلك قریة
امرنا مترفیھا ففسقوا
فیھا فحق علیھا
القول فدمرنٰھا
تدمیرا ٥ (١٦)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو
پہلے اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں
اور وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے ہیں۔
اس کے بعد عذاب کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو جاتا ہے
اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اس آیت کے تین مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی بستی کی ہلاکت کا وقت

---

[1] سورۃ البقرہ، ٢٥٦

[2] الکشاف عن حقائق التنزیل: ١/٣٨٧

قریب آن لگتا ہے تو ہم اس کے آسودہ حال لوگوں کو فسق و فجور کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ زمخشری کہتے ہیں:

امرناھم بالفسق ففعلوا۔

ہم نے انھیں فسق کا حکم دیا اور انھوں نے اس پر عمل کیا۔

یہاں حکم دینے کا مطلب ہے آسودگی اور خوش حالی کا فراہم کرنا۔ یہ چیز خیر و فلاح کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم خوش حالی میں خدا کو بھول جاتی اور فسق و فجور کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو تباہ کر دی جاتی ہے۔ زمخشری کو اصرار ہے کہ آیت کے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں[1]

اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ "امرنا" یہاں "کثّرنا" کے معنی میں ہے۔ یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے مترفین اور خوش حال افراد میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

اس کا تیسرا مطلب وہ ہے جو مولانا فراہی بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بیان ہوا ہے:

وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا۔

ہم کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتے جب تک اس میں رسول نہ بھیج دیں۔

اس قانون کے بیان کرنے کے بعد کہا گیا کہ جب کسی قوم کے آسودہ حال افراد خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں اور عیش و عشرت اور فسق و فجور میں ڈوب کر ہلاکت کے مستحق ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیجتا ہے جو انھیں اس کے احکام و مرضیات سے آگاہ کرتا ہے، اسی میں اس کا امتحان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ نافرمانی اور معصیت ہی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قانون اپنا کام کرنے لگتا ہے اور وہ تباہ کر دی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انذار کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں آتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔

یہی تفسیر عام طور پر مفسرین نے کی ہے۔ جلالین کی مختصر عبارت یہاں نقل کی جا رہی ہے:

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل: ٢/٤٤٦

(امرنا مترفیها) منعیها بمعنی رؤسائها بالطاعة علیٰ لسان رسلنا (ففسقوا فیها) فخرجوا عن امرنا... [1]	ہم نے ان کے مترفین کو یعنی انکے اصحاب دولت اور رؤسا کو اپنے رسولوں کی زبان سے اطاعت کا حکم دیا لیکن انھوں نے اس میں (بستی میں) فسق کی راہ اختیار کی، یعنی ہمارے احکام سے خروج کیا۔

بعض تفسیری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [2]

سورہ بنی اسرائیل میں ہے ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا [3] یہاں عام طور پر مفسرین نے روح سے روح حیوانی مراد لی ہے۔ مولانا فراہیؒ کہتے ہیں کہ یہ سوال وحی سے متعلق تھا مولانا کے خیال کی تائید ایک تو اوپر کے مضمون سے ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ سلف میں اس رائے کے قائلین موجود ہیں۔ علامہ آلوسی نے اس سوال کو روح حیوانی ہی سے متعلق مانا ہے اور روح کی حقیقت پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں قال الحسن وقتادہ الروح ھو جبرائیل وقد سمی روحا فی قولہ تعالیٰ (نزل بہ الروح الامین علی قلبك) والسوال عن کیفیة نزولہ والقائہ الوحی الیہ علیہ الصلوٰة والسلام وقال بعضھم ھو القرآن وقد سمی روحا فی قولہ تعالیٰ: (وکذٰلك اوحینا الیك روحا من امرنا [4]) آگے چل کر یہ بھی بتایا ہے کہ یہ مفہوم سیاقِ کلام سے قریب بھی ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مولانا فراہیؒ نے پورے تفسیری ذخیرہ کو کھنگالا ہے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ انھوں نے یہی نہیں ہے کہ اس کا جوہر اخذ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے۔

---

[1] جلالین

[2] روح المعانی ۱۵/۴۳

[3] سورہ بنی اسرائیل

[4] روح المعانی ۱۵/۱۵۲